ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 464

Program: Associate Degree (Islamic Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اسلامی فقہ (464) • سطح: ایسوسی ایٹ ڈگری (علوم اسلامیہ)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • امتحانی مشق نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کو غور سے پڑھیں، مفاہیم کو سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ بعینہ نقل کرنے سے گریز کریں، کیونکہ اصل مقصد فقہی مسائل کی سمجھ پیدا کرنا ہے۔

سوال نمبر 1: نکاح کے ارکان اور محرماتِ نکاح کے اصول و احکام (20 نمبر)

سوال نمبر 1: نکاح کے ارکان اور محرماتِ نکاح کے اصول و احکام کا تفصیلی جائزہ پیش کریں۔

تعارف

نکاح اسلام کے معاشرتی نظام کی بنیاد اور خاندانی ادارے کا نقطۂ آغاز ہے۔ قرآن مجید نے نکاح کو محض ایک سماجی رسم نہیں بلکہ ایک پختہ عہد قرار دیا ہے، چنانچہ سورۃ النساء میں اسے «میثاقاً غلیظاً» یعنی مضبوط عہد و پیمان کہا گیا ہے۔ اسی عہد کے ذریعے مرد و عورت کے تعلق کو حلال، باعزت اور ذمہ داریوں سے بھرپور صورت ملتی ہے، نسلِ انسانی کی بقا

کا جائز ذریعہ قائم ہوتا ہے اور معاشرے میں عفت و پاک دامنی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ فقہ اسلامی نے نکاح کے انعقاد کے لیے کچھ ارکان و شرائط مقرر کی ہیں جن کے بغیر یہ عہد شرعاً درست نہیں ہوتا، اور ساتھ ہی ان رشتوں کی واضح حد بندی بھی کی ہے جن کے درمیان نکاح ہمیشہ یا عارضی طور پر حرام ہے، جنہیں محرماتِ نکاح کہا جاتا ہے۔

اس سوال میں پہلے نکاح کے ارکان و شرائط کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا اور پھر محرماتِ نکاح کے اصول، اقسام اور احکام بیان کیے جائیں گے۔ یہ دونوں مباحث فقہِ نکاح کی بنیاد ہیں، کیونکہ اگر ارکان میں خلل ہو تو نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا یا فاسد قرار پاتا ہے، اور اگر کسی محرم عورت سے نکاح کر لیا جائے تو وہ باطل اور حرام فعل ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی و قانونی نتائج کا حامل بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ان اصولوں کی درست سمجھ ناگزیر ہے۔

نکاح کی تعریف اور اس کے ارکان

لغت میں نکاح کے معنی ملاپ اور ضم ہونے کے ہیں، جبکہ اصطلاحِ شرع میں نکاح وہ عقد ہے جس کے ذریعے مرد و عورت کے لیے ایک دوسرے سے جائز طور پر استمتاع حلال ہو جاتا ہے اور دونوں پر باہمی حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ائمہ فقہ کی تعریفوں میں معمولی لفظی اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن سب کا مفہوم یہی ہے کہ نکاح ایک شرعی معاہدہ ہے جو ایجاب و قبول سے وجود میں آتا ہے اور اس پر مہر، نفقہ، میراث اور نسب جیسے اہم آثار مرتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے نکاح کو محض اجازت نامہ نہیں بلکہ ذمہ داریوں کا ایک مکمل نظام سمجھا جاتا ہے۔

نکاح کا بنیادی رکن ایجاب و قبول ہے۔ ایجاب سے مراد وہ پیش کش ہے جو ایک فریق کی طرف سے کی جائے اور قبول سے مراد دوسرے فریق کی طرف سے اسی مجلس میں اسے منظور کرنا ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک ایجاب و قبول ہی اصل رکن ہے، جبکہ دیگر شرائط اس عقد کی صحت اور نفاذ کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ ایجاب و قبول کے صحیح ہونے کے لیے چند شرائط ہیں: دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں، یعنی پیش کش اور قبول کے درمیان مجلس ختم نہ ہوئی ہو؛ الفاظ ماضی کے صیغے میں ہوں یا ان میں سے ایک ماضی اور دوسرا حال کے معنی میں مستعمل ہو؛ ایجاب و قبول میں مطابقت ہو، یعنی قبول اسی چیز کا ہو جس کی پیش کش کی گئی تھی؛ اور دونوں فریق اہلیت رکھتے ہوں، یعنی عاقل اور بالغ ہوں یا ان کی طرف سے ان کے اولیا یہ عقد کریں۔

نکاح کے انعقاد کے سلسلے میں گواہوں کی شرط بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ جمہور فقہا کے نزدیک نکاح کا اعلان اور گواہی اس کی صحت کے لیے لازم ہے تاکہ خفیہ تعلق اور جائز تعلق میں فرق واضح رہے اور بعد میں نسب و حقوق کے جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ حنفیہ کے نزدیک گواہ دو آزاد، عاقل، بالغ مسلمان مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، اور وہ مجلسِ عقد میں حاضر ہو کر ایجاب و قبول کے الفاظ سنیں۔ گواہوں کی عدم موجودگی میں نکاح فقہائے احناف کے نزدیک فاسد قرار پاتا ہے۔ اسی طرح ولی کا مسئلہ بھی اہم ہے: جمہور کے نزدیک عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر درست نہیں، جبکہ احناف کے نزدیک بالغ عاقلہ عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے، بشرطیکہ نکاح کفو میں ہو؛ اگر غیر کفو میں ہو تو ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہوتا ہے۔

نکاح کی شرائط: صحت، نفاذ اور لزوم

فقہا نے نکاح کی شرائط کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی شرائطِ انعقاد ہیں، جن کے بغیر عقد وجود ہی میں نہیں آتا، جیسے فریقین کی اہلیت، ایجاب و قبول کا ایک مجلس میں ہونا اور الفاظ کا صریح یا کنایہ ہونا۔ دوسری شرائطِ صحت ہیں، جن کے بغیر نکاح فاسد ہو جاتا ہے، جیسے گواہوں کی موجودگی اور عورت کا محرم نہ ہونا۔ تیسری شرائطِ نفاذ و لزوم ہیں، جن کا تعلق اس بات سے ہے کہ عقد نافذ اور لازم ہو، مثلاً عقد کرنے والا خود مختار ہو، فضولی کے عقد کا حکم الگ ہے اور ولی کی اجازت سے وہ نافذ ہوتا ہے۔ ان شرائط کی رعایت سے نکاح قانونی طور پر محکم اور محفوظ رہتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ موجودہ پاکستانی قانون میں نکاح کی رجسٹریشن لازمی ہے اور نکاح نامہ بھر کر یونین کونسل میں درج کرایا جاتا ہے۔ اگرچہ رجسٹریشن نہ ہونے سے شرعاً نکاح باطل نہیں ہوتا، مگر یہ قانونی ثبوت کا بہترین ذریعہ ہے جس سے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسی طرح عمر کی قانونی حد کا احترام بھی شہری ذمہ داری ہے۔ فقہ و قانون کی یہ ہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ شرائطِ نکاح کا مقصد کسی کو تنگی میں ڈالنا نہیں بلکہ فریقین کے حقوق کو دستاویزی تحفظ دینا ہے۔

محرماتِ نکاح: مفہوم اور عمومی اصول

محرمات سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے نکاح کرنا شرعاً حرام ہو۔ ان کی تفصیل سورۃ النساء کی آیت نمبر 23 میں جامع انداز میں بیان کر دی گئی ہے اور سنت و اجماع نے اس کی مزید وضاحت کی ہے۔ محرمات کی حرمت کے اصولوں میں پہلا اصول یہ ہے کہ حرمت کے اسباب تین بڑے ہیں: نسب، رضاعت اور مصاہرت یعنی سسرالی رشتہ۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ بعض محرمات کی حرمت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے، جنہیں محرماتِ ابدیہ کہتے ہیں، اور بعض کی حرمت کسی عارضی سبب کی بنا پر ہوتی ہے جو سبب ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے، جنہیں محرماتِ عارضیہ کہتے ہیں۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ حرمت کا مدار شریعت کے بیان کردہ سبب پر ہے؛ جہاں سبب موجود ہو وہاں حرمت ثابت ہو گی خواہ حکمت ظاہر ہو یا نہ ہو، البتہ فقہا نے ان احکام کی حکمتوں کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔

حرمتِ نکاح کے باب میں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ محرم ہونے کا ایک اضافی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے درمیان پردے کے احکام نرم ہو جاتے ہیں، سفر و خلوت کی اجازت ہوتی ہے اور عورت ان کے ساتھ محرم کے طور پر سفر کر سکتی ہے۔ دوسری جانب جن عورتوں سے محض نکاح حرام ہے مگر وہ نسب وغیرہ کی وجہ سے محرم نہیں، جیسے اجنبی عورت، ان کے سلسلے میں پردے کے عام احکام لاگو رہتے ہیں۔ اگلے حصوں میں ان اقسام کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

نسب کی بنا پر محرمات

نسبی محرمات وہ عورتیں ہیں جن سے خون کا رشتہ ہو۔ قرآن مجید نے انہیں شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ تم پر تمھاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں حرام کی گئی ہیں۔ اس فہرست کی تشریح فقہا نے اصول کے تحت کی ہے: ہر وہ عورت جو مرد کی اصول میں سے ہو، یعنی ماں، نانی، دادی اوپر تک، اور ہر وہ جو اس کی فروع میں سے ہو، یعنی بیٹی، پوتی، نواسی نیچے تک، اس پر حرام ہے۔ اسی طرح باپ کی اصول کی فروع، یعنی بہن اور پھوپھی، اور ماں کی فروع میں سے خالہ بھی شامل ہے۔ بھائی کی بیٹی اور بہن کی بیٹی اسی قاعدے سے محرم ہیں۔

نسبی حرمت کی حکمت واضح ہے: قریبی خون کے رشتوں میں شادی سے خاندانی تقدس مجروح ہوتا ہے، ماں، بہن اور بیٹی جیسے رشتے محبت و احترام کے ہیں نہ کہ ازدواجی تعلق کے، اور طبی و نسلِ انسانی کے اعتبار سے بھی قریبی رشتوں کی شادیاں کئی پیچیدگیوں کا سبب بنتی ہیں۔ اسلام نے ان رشتوں کی حرمت قائم کر کے خاندان کے اندر عفت و پاکیزگی کو محفوظ کیا اور خاندانی محبت کو اس کے اصل دائرے میں برقرار رکھا۔

رضاعت اور مصاہرت کی بنا پر محرمات

رضاعت یعنی دودھ کے رشتے سے بھی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ حدیث پاک کا اصول ہے کہ رضاعت سے وہی رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ چنانچہ رضاعی ماں، رضاعی بہن اور ان سے متفرع رشتے بھی محرم ہیں، جس کی تفصیل آئندہ سوالات میں آئے گی۔ شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے کا عمل مقررہ مدت یعنی دو سال کے اندر ہوا ہو اور دودھ بچے کے حلق تک پہنچا ہو۔ رضاعت کی حرمت کا مقصد اس رشتے کا احترام ہے جو دودھ کے ذریعے وجود میں آتا ہے، کیونکہ بچے کا جسم اسی دودھ سے بنتا ہے اور یوں رضاعی ماں حقیقی ماں کے درجے میں عزت پاتی ہے۔

مصاہرت یعنی نکاح کے سبب پیدا ہونے والے سسرالی رشتے بھی حرمت کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان میں ساس کو شمار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تمھاری بیویوں کی مائیں تم پر حرام ہیں؛ یہ حرمت محض عقدِ نکاح سے ہی ثابت ہو جاتی ہے، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح ربیبہ یعنی بیوی کی بیٹی (کسی اور شوہر سے) اس وقت حرام ہوتی ہے جب اس کی ماں کے ساتھ خلوتِ صحیحہ ہو چکی ہو، ورنہ نہیں۔ بیٹے کی بیوی (بہو) اور باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) بھی مصاہرت ہی کی بنا پر ابدی محرم ہیں۔ ان احکام سے خاندان میں اعتماد اور تقدس قائم رہتا ہے اور سسرالی رشتے شک و شبہے سے پاک رہتے ہیں۔

عارضی محرمات اور دیگر اسبابِ حرمت

بعض عورتیں کسی عارضی سبب سے حرام ہوتی ہیں اور سبب ختم ہونے پر ان سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا ہے؛ قرآن مجید نے فرمایا کہ دو بہنوں کو اکٹھا کرنا حرام ہے۔ اسی قاعدے کے تحت عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو بھی ایک نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حدیث میں صراحت آئی

ہے۔ جب ایک بیوی وفات پا جائے یا طلاق کے بعد عدت گزر جائے تو دوسری بہن سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چار بیویاں پہلے سے نکاح میں موجود ہوں تو پانچویں سے نکاح اس وقت تک حرام ہے جب تک ان میں سے کسی ایک سے جدائی نہ ہو جائے۔

تیسری صورت عدت والی عورت ہے: جو عورت طلاق یا وفات کی عدت میں ہو اس سے نکاح حرام ہے، اور طلاقِ مغلظہ والی عورت اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک وہ شرعی حلالے کے تقاضے پورے نہ کرے، یعنی دوسرے شوہر سے حقیقی نکاح اور پھر اس سے جدائی کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ چوتھی صورت حالتِ احرام ہے جس میں نکاح کرنا حدیث کی رو سے منع ہے۔ پانچویں صورت مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح ہے جو بالاتفاق باطل ہے، اور مسلمان مرد کے لیے بھی مشرکہ عورت سے نکاح حرام ہے، البتہ اہلِ کتاب کی پاک دامن عورت سے نکاح کی اجازت قرآن مجید نے دی ہے۔ یہ تمام صورتیں بتاتی ہیں کہ عارضی حرمت کا تعلق کسی ایسے مانع سے ہے جو خود نکاح کے رشتے کی ذات سے نہیں بلکہ خارج سے عارض ہوا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح کا درست انعقاد ایجاب و قبول، اہلیت، مجلس کی وحدت، گواہوں کی موجودگی اور ولی کے مسئلے میں فقہی ضابطوں کی رعایت پر منحصر ہے، اور انہی شرائط سے یہ عقد معاشرے میں ایک باعزت اور محفوظ ادارے کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف محرماتِ نکاح کا نظام نسب، رضاعت اور مصاہرت کے ابدی رشتوں اور جمع، عدت و تعداد جیسے عارضی اسباب پر مبنی ہے، جس کا مقصد خاندانی تقدس، نسل کی حفاظت اور معاشرتی عفت کا تحفظ ہے۔ طالب علم پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں مباحث کو باہم جوڑ کر سمجھے، کیونکہ ارکان کی درستی نکاح کو وجود دیتی ہے اور محرمات کی پہچان اس وجود کو حرام سے بچاتی ہے۔ یہی توازن فقہِ نکاح کی اصل روح ہے۔

سوال نمبر 2: رضاعت کے احکام اور اس سے قائم ہونے والے محرمات (20 نمبر)

سوال نمبر 2: رضاعت کے احکام اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے محرمات کی تفصیلی وضاحت کریں۔

تعارف

رضاعت سے مراد وہ دودھ کا رشتہ ہے جو کسی عورت کے دودھ پینے سے بچے اور اس عورت و اس کے خاندان کے درمیان قائم ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس رشتے کو نسبی رشتے کے قریب درجہ دیا ہے، کیونکہ جس دودھ سے بچے کا گوشت اور ہڈیاں بنتی ہیں، اس کی فراہم کرنے والی عورت بچے کی پرورش میں حقیقی ماں جیسا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے سورۃ النساء میں محرمات شمار کرتے ہوئے کہا کہ تم پر تمھاری مائیں بھی حرام ہیں جنہوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری رضاعی بہنیں بھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رضاعت سے وہی کچھ حرام ہوتا ہے جو پیدائش یعنی نسب سے حرام ہوتا ہے۔

رضاعت کے احکام کی عملی اہمیت بہت زیادہ ہے، خاص طور پر دیہی معاشرے میں جہاں عورتیں اکثر دوسرے کے بچوں کو دودھ پلانے کی روایت عام رہی ہے۔ اگر ان احکام سے بے خبری ہو تو نادانستہ طور پر ایسے رشتے بھی طے پانے کا خدشہ رہتا ہے جو شرعاً حرام ہوں، یا اس کے برعکس انسان کی وجہ سے حلال رشتوں سے اجتناب ہونے لگتا ہے۔ ذیل میں رضاعت کی تعریف و شرائط، مدت و مقدار، اس کے ثبوت کے طریقے اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے محرمات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

رضاعت کی تعریف اور شرعی بنیاد

لغت میں رضاعت کے معنی دودھ پینے کے ہیں، اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد بچے کا مدتِ رضاعت کے اندر کسی عورت کا دودھ اس طرح پینا ہے کہ دودھ اس کے حلق تک پہنچے۔ یہ دودھ عورت کے پستان سے براہ راست پیا جائے یا کسی برتن میں نکال کر پلایا جائے، دونوں صورتوں میں حرمت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ مدار دودھ کے بچے کے جسم میں داخل ہونے پر ہے نہ کہ طریقے پر۔ البتہ شرط یہ ہے کہ دودھ اس عورت کا ہو اور اس کے جسم سے مخصوص مدت میں نکلا ہو، اور فقہا کے ہاں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ اگر شوہر دودھ اترنے کا سبب بنا ہو تو وہ دودھ پینے والے بچے کا رضاعی باپ قرار پاتا ہے، کیونکہ حدیث میں دودھ کا تعلق شوہر کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔

رضاعت کی حرمت کی بنیاد نصِ قرآنی اور سنتِ ثابتہ ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے بعد نکاح کے باب میں یہ نسب کی طرح معتبر ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھنا چاہیے کہ رضاعت کا اثر صرف نکاح کی حرمت اور محرمیت تک محدود ہے۔ رضاعی رشتوں میں نہ میراث جاری ہوتی ہے، نہ نفقہ واجب ہوتا ہے اور نہ ہی نسب کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ بچے کا نسب اس کے حقیقی والدین ہی سے ثابت رہتا ہے۔ یوں شریعت نے رضاعت کو اس کے اصل دائرے میں رکھ کر دونوں رشتوں کے حقوق میں توازن قائم کیا ہے۔

مدتِ رضاعت اور مقدار کا مسئلہ

رضاعت کی مدت کے بارے میں قرآن مجید نے سورۃ البقرہ میں فرمایا کہ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے، اور سورۃ الاحقاف میں حمل و رضاعت کی مجموعی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے۔ فقہا کی اکثریت کے نزدیک دو سال کے بعد پینے والے دودھ سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے بعد بچے کی اصل غذا کھانا بن جاتی ہے اور دودھ اس کی نشوونما کا بنیادی ذریعہ نہیں رہتا۔ اسی مدت کو بنیاد بنا کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر دو سال کے اندر دودھ پلایا گیا ہو تو حرمت کا حکم لاگو ہو گا۔

دودھ کی مقدار کے بارے میں فقہا میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تھوڑا ہو یا زیادہ، اگر دودھ حلق تک پہنچ جائے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ قرآن مجید نے رضاعت کو مطلق بیان کیا ہے اور اس پر کوئی تعداد کی قید نص میں نہیں آئی۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک کم از کم پانچ مرتبہ الگ الگ موقعوں پر دودھ پینا ضروری ہے، اور ان کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں پہلے دس رضعات اور پھر پانچ رضعات کے حکم کا ذکر آتا ہے۔ دونوں آراء کی بنیاد دلائل پر ہے، اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ اختلاف کی وجوہ کو سمجھے اور اپنے مسلک کے مفتی بہ قول پر عمل کرے، کیونکہ یہ مسئلہ نکاح جیسے حساس باب سے متعلق ہے۔

رضاعت کے ثبوت کے طریقے

رضاعت کا تعلق چونکہ مستقبل کے ازدواجی رشتوں سے ہے، اس لیے اس کے ثبوت میں احتیاط لازم ہے۔ فقہا کے نزدیک رضاعت دو طریقوں سے ثابت ہوتی ہے: پہلا اقرار ہے، یعنی متعلقہ فریق خود تسلیم کر لے کہ فلاں عورت نے اسے دودھ پلایا تھا؛ جب اقرار شرعی شرائط کے ساتھ ہو جائے تو اس پر حرمت کا حکم مرتب ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ

گواہی ہے؛ عادل گواہوں کی شہادت سے بھی رضاعت ثابت مانی جاتی ہے، اور فقہانے اس باب میں عورت کی گواہی کو بھی معتبر قرار دیا ہے، کیونکہ دودھ پلانا عام طور پر عورتوں کے دائرے کی بات ہوتی ہے اور مردوں کی اطلاع اس تک کم ہی پہنچتی ہے۔

عملی زندگی میں رضاعت کے واقعات کو فراموش کر دینا بڑی غلطی ثابت ہو سکتا ہے۔ اہلِ علم اسی لیے نصیحت کرتے ہیں کہ اگر کسی بچے کو کسی دوسری عورت نے دودھ پلایا ہو تو اس کا ریکارڈ رکھا جائے اور یہ بات خاندان میں مشہور ہو تاکہ آئندہ نسل میں رشتے طے کرتے وقت غلطی نہ ہو۔ پاکستانی معاشرے میں یہ مسئلہ اسپتالوں میں بچوں کی تبدیلی یا رضاعت کے پرانے واقعات کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے، اور ایسے مواقع پر محتاط علما سے رجوع کرنا ہی درست راستہ ہے، کیونکہ محض شک و شبہے کی بنیاد پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاتا؛ شک سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، ثبوت یقینی یا کم از کم شرعی معیار کے مطابق ہونا چاہیے۔

رضاعت سے قائم ہونے والے محرمات

رضاعت ثابت ہو جانے کے بعد دودھ پینے والا بچہ اس عورت کے لیے اس کے حقیقی بچے کی طرح محرم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں درج ذیل رشتے محرم قرار پاتے ہیں: دودھ پلانے والی عورت بچے کی رضاعی ماں ہے، اس سے نکاح حرام ہے۔ دودھ پلانے والی کا شوہر، جس کی طرف دودھ منسوب ہے، رضاعی باپ ہے۔ اس عورت کے حقیقی بچے دودھ پینے والے کے رضاعی بھائی بہن ہیں، خواہ وہ اسی دودھ کے دور کے ہوں یا پہلے یا بعد کے ہوں۔ اسی طرح رضاعی ماں کی بہن رضاعی خالہ، رضاعی باپ کی بہن رضاعی پھوپھی اور دیگر متفرع رشتے بھی اسی اصول سے محرم ہوتے ہیں۔ حدیث کا عمومی قاعدہ یہی ہے کہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں، وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں۔

اس کے برعکس بعض رشتے رضاعت سے محرم نہیں ہوتے جن میں عموماً لوگ غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً دودھ پینے والے کے سگے بھائی کے لیے وہ عورت محرم نہیں جس نے صرف اس کے بھائی کو دودھ پلایا ہو، کیونکہ حرمت کا تعلق خود دودھ پینے والے اور دودھ پلانے والی کے خاندان کے ان رشتوں سے ہے جو اس بچے کی نسبت سے بنتے ہیں۔ اسی طرح ہر قریبی سمجھا جانے والا رشتہ خود بخود محرم نہیں بنتا بلکہ نسبت کا درست تعین ضروری ہوتا ہے۔ ان باریکیوں کی وجہ سے فقہانے اصول دیا ہے کہ حرمت کا دائرہ وہی ہے جو نسب کے قاعدے سے براہِ راست نکلتا ہو؛ اس سے آگے بڑھنے میں احتیاط کی جائے۔

رضاعت کی حکمتیں اور معاشرتی اثرات

رضاعت کو محرمیت کا سبب بنانے میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ پہلی حکمت یہ ہے کہ دودھ بچے کے جسم کی تعمیر کرتا ہے، اس لیے جس عورت کے جسم کے جزو سے بچہ پروان چڑھا ہو، اس سے ازدواجی تعلق اخلاقی طور پر ناقابلِ قبول اور فطرت کے خلاف ہے۔ دوسری حکمت احترامِ مادیت کا تحفظ ہے: رضاعی ماں نے ماں جیسی خدمت انجام دی ہوتی ہے، لہٰذا شریعت نے اسے ماں کی حرمت و عزت عطا کر دی۔ تیسری حکمت معاشرتی ہے: بچپن میں ایک چھت تلے پلنے والے بچے بھائی بہن کے ماحول میں بڑے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے درمیان نکاح کو روکنا خاندانی پاکیزگی کے عین مطابق ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ رضاعت کے رشتے سے خاندانوں کے درمیان محبت اور میل جول کا ایک نیا اور پاکیزہ رشتہ قائم ہوتا ہے۔ دودھ پینے والا بچہ عمر بھر رضاعی ماں اور اس کے بچوں سے بھائی بہن جیسا سلوک کرتا ہے، ان کی خوشی غمی میں شریک ہوتا ہے اور پردے کی پابندی کے بغیر ان کے گھر آ جا سکتا ہے۔ یوں رضاعت کا نظام دراصل امت کے اندر رشتوں کا دائرہ وسیع کرنے اور باہمی اعتماد بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس نظام کی پاسداری اسی وقت ممکن ہے جب لوگ اس کے احکام سے واقف ہوں اور دودھ پلانے کے واقعات کو سنجیدگی سے محفوظ رکھیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ رضاعت ایک شرعی رشتہ ہے جو دو سال کی مدت کے اندر کسی عورت کا دودھ بچے کے حلق تک پہنچنے سے قائم ہوتا ہے، مقدار کے مسئلے میں فقہا کا معروف اختلاف اپنی جگہ موجود ہے۔ اس رشتے کے ثابت ہونے پر رضاعی ماں، رضاعی باپ، ان کے بچے اور متفرع رشتے اسی طرح محرم ہو جاتے ہیں جس طرح نسبی رشتے ہوتے ہیں، لیکن میراث، نسب اور نفقے جیسے حقوق اس سے وابستہ نہیں ہوتے۔ رضاعت کے ثبوت میں اقرار اور گواہی معتبر ہیں اور محض شک کافی نہیں۔ ان احکام کی درست معلومات خاندانوں کو حرام رشتوں سے بچاتی ہے اور یہی اس باب کا اصل مقصد ہے۔

سوال نمبر 3: نکاحِ صحیح، نکاحِ فاسد اور نکاحِ باطل کا تقابلی جائزہ (20 نمبر)

سوال نمبر 3: نکاحِ صحیح، نکاحِ فاسد اور نکاحِ باطل کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔ ہر ایک کی تعریف، اسباب، اور قانونی اثرات واضح کریں۔

تعارف

ہر عقد کی طرح نکاح کے بھی شرعی اعتبار سے مختلف درجے ہیں۔ جب نکاح تمام ارکان و شرائط کے ساتھ منعقد ہو تو وہ صحیح کہلاتا ہے اور اس کے تمام قانونی و شرعی آثار مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی عقد کی بنیاد تو درست ہوتی ہے مگر کسی خارجی وصف میں خلل آ جاتا ہے، ایسی صورت میں حنفی فقہ اسے فاسد قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر عقد کی اصل ہی شریعت کی ممانعت سے ٹکرا جائے، مثلاً کسی ابدی محرم سے نکاح کر لیا جائے، تو وہ باطل ہوتا ہے اور اس کا کوئی شرعی اثر نہیں ہوتا۔ ان تینوں اقسام کی پہچان محض علمی بحث نہیں بلکہ اس پر مہر، نسب، عدت، میراث اور جدائی کے طریقے جیسے بڑے بڑے احکام منحصر ہیں۔

یہ تقسیمِ ثلاثہ فقہِ احناف کی ممتاز خصوصیات میں سے ہے؛ دیگر فقہی مکاتب میں فاسد اور باطل کو عموماً ایک ہی درجے میں رکھا گیا ہے، لیکن احناف نے عقد کے اصل اور وصف میں فرق کر کے درمیانی صورتوں کے لیے الگ احکام مقرر کیے ہیں۔ ذیل میں تینوں اقسام کی تعریف، اسباب اور آثار کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ طالب علم کو فرق واضح ہو جائے۔

نکاحِ صحیح کی تعریف اور اس کے اثرات

نکاحِ صحیح وہ عقد ہے جس کا اصل بھی مشروع ہو اور وصف بھی درست ہو، یعنی اس کے تمام ارکان و شرائط پوری ہو چکی ہوں: فریقین اہل ہوں، ایجاب و قبول ایک مجلس میں ہوا ہو، گواہ موجود ہوں، عورت کسی کی شرعی محرم نہ ہو اور نہ ہی کسی مانعِ عارضی کا شکار ہو۔ ایسے نکاح کے تمام آثار فوری طور پر مرتب ہوتے ہیں: باہمی استمتاع حلال ہو جاتا ہے، مہر عورت کا حق بن جاتا ہے، خلوتِ صحیحہ کے بعد مہر مکمل واجب ہو جاتا ہے، دونوں پر نفقہ و حسنِ معاشرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں، بچوں کا نسب ثابت ہوتا ہے، فریقین ایک دوسرے کے وارث بنتے ہیں اور مصاہرت کی حرمت قائم ہو جاتی ہے۔

نکاحِ صحیح کے لازم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ختم کرنے کے لیے طلاق، خلع یا عدالت کی تفریق جیسے باقاعدہ طریقے درکار ہوتے ہیں؛ کوئی فریق یک طرفہ طور پر اسے کالعدم قرار نہیں دے سکتا۔ اگر نکاحِ صحیح کے بعد شوہر وفات پا جائے تو بیوی کو عدتِ وفات بھی گزارنی ہوتی ہے اور میراث میں بھی حصہ ملتا ہے۔ یہی وہ مکمل صورت ہے جس کا شریعت تقاضا کرتی ہے اور جس پر خاندانی نظام کا استحکام قائم ہے۔

نکاحِ فاسد کی تعریف اور اسباب

نکاحِ فاسد وہ عقد ہے جس کا اصل مشروع ہو لیکن اس کے کسی وصف میں فساد آ گیا ہو، یعنی سبب ممانعت عارضی یا وصفی نوعیت کا ہو۔ حنفی تعریف کے مطابق اصل سے مراد ایجاب و قبول اور فریقین کی اہلیت ہے، اور وصف سے مراد وہ امور ہیں جو عقد کے کمال و صحت کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ جب اصل درست ہو مگر وصف خراب ہو تو عقد فاسد ہوتا ہے؛ اس میں جدائی واجب ہوتی ہے مگر خلوت کے بعد کچھ آثار بھی مرتب ہوتے ہیں، جو اسے باطل سے ممتاز کرتے ہیں۔

نکاحِ فاسد کے مشہور اسباب یہ ہیں: گواہوں کے بغیر نکاح کرنا؛ دو بہنوں کو ایک زمانے میں نکاح میں جمع کرنا؛ پانچویں عورت سے اس حال میں نکاح کرنا کہ چار بیویاں نکاح میں موجود ہوں؛ عدت والی عورت سے نکاح کرنا؛ اور مطلقۂ مغلظہ سے بغیر شرعی حلالے کے دوبارہ نکاح کرنا۔ ان تمام صورتوں میں ممانعت کا سبب عورت کی ذات میں دائمی نہیں بلکہ اس کی موجودہ حالت یا عقد کے طریقے میں ہے، اسی لیے ان کا درجہ باطل سے الگ رکھا گیا ہے۔ یاد رہے کہ نکاحِ متعہ کو احناف باطل کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اصل مقصد یعنی دائمی ازدواجی تعلق کے خلاف ہے، جبکہ بعض دیگر مکاتب کی رائے اس میں مختلف ہے۔

نکاحِ باطل کی تعریف اور اسباب

نکاحِ باطل وہ عقد ہے جس کا اصل ہی غیر مشروع ہو، یعنی وہ کسی ایسے سبب کی بنا پر کیا گیا ہو جو شریعت میں مطلقاً حرام ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ ایسا عقد قانونِ شرع کی نظر میں عدم کے مترادف ہے؛ نہ اس پر میاں بیوی کے حقوق مرتب ہوتے ہیں اور نہ ہی اسے ختم کرنے کے لیے طلاق کی حاجت ہوتی ہے، بلکہ اس رشتے کو فی الفور ختم کرنا دونوں پر فرض ہوتا ہے اور عدالتیں بھی اسے ابتداءً ہی کالعدم قرار دیتی ہیں۔

نکاحِ باطل کے اسباب میں سب سے اہم محرماتِ ابدیہ سے نکاح ہے، خواہ حرمت نسب سے ہو، رضاعت سے ہو یا مصاہرت سے۔ اسی طرح مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح باطل ہے، اور ایسی عورت سے نکاح بھی باطل ہے جو کسی اور کے نکاح میں موجود ہو، کیونکہ وہ دوسرے کے حق سے مقید ہے۔ باطل نکاح میں اگر قربت واقع ہو بھی جائے تو وہ شرعاً کوئی حلال اثر پیدا نہیں کرتی؛ مہر، نسب اور میراث کے احکام عام ضابطے کے مطابق نہیں بنتے، البتہ شبہے کی صورت میں فقہا نے بچے کے نسب کو ثابت رکھنے اور عورت کو عدت گزارنے جیسے احتیاطی احکام اس لیے دیے ہیں تاکہ معصوم بچوں اور عورت کو نقصان نہ پہنچے اور معاشرے میں فتنہ نہ پھیلے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باطل کو باطل کہنے کے باوجود شریعت انسانی مصالح کی رعایت بھی کرتی ہے۔

قانونی و شرعی اثرات کا تقابل

تینوں اقسام کے اثرات میں بنیادی فرق یوں سمجھنا چاہیے کہ نکاحِ صحیح میں تمام آثار کامل طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ نکاحِ فاسد میں خلوت سے پہلے کوئی اثر نہیں ہوتا، لیکن خلوتِ صحیحہ ہو جائے تو مہر مثل (یا مسمّی مہر میں سے جو کم ہو) واجب ہو جاتا ہے، عورت پر عدت لازم آتی ہے، بچے کا نسب ثابت ہوتا ہے اور جدائی ضروری ہو جاتی ہے؛ تاہم میراث اس میں ثابت نہیں ہوتی اور جدائی طلاق کے بغیر عدالت یا باہمی تفریق سے ہوتی ہے۔ نکاحِ باطل میں اصلاً کوئی اثر نہیں، نہ مہر لازم آتا ہے نہ میراث، اور رشتہ بلا تاخیر ختم کرنا فرض ہوتا ہے۔ یہ بتدریج فرق عقد کے اصل و وصف کے فرق کا منطقی نتیجہ ہے۔

جدول: نکاحِ صحیح، فاسد اور باطل کا تقابلی جائزہ

پہلو	نکاحِ صحیح	نکاحِ فاسد	نکاحِ باطل
تعریف	اصل و وصف دونوں درست	اصل درست، وصف میں فساد	اصل ہی غیر مشروع
مثال	تمام شرائط کے ساتھ نکاح	بغیر گواہ نکاح، دو بہنوں کو جمع کرنا	محرمِ ابدی سے نکاح
مہر	مہر مسمّی مکمل واجب	خلوت کے بعد مہر مثل یا مسمّی میں سے کم	اصلاً مہر واجب نہیں
نسب	ثابت ہوتا ہے	خلوت کے بعد ثابت ہوتا ہے	اصلاً ثابت نہیں، شبہے میں احتیاطاً ثابت
عدت	طلاق / وفات پر لازم	جدائی پر لازم (خلوت کے بعد)	احتیاطاً لازم ہو سکتی ہے

میراث	فریقین وارث ہوتے ہیں	ثابت نہیں ہوتی	ثابت نہیں ہوتی
جدائی کا طریقہ	طلاق، خلع یا عدالتی تفریق	تفریق واجب، طلاق لازم نہیں	فی الفور علیحدگی فرض، عقد کالعدم

پاکستانی قانون کی روشنی میں دیکھیں تو عدالتیں اس تقسیم کو عملی طور پر استعمال کرتی ہیں۔ غیر رجسٹرڈ مگر شرعی ارکان کے ساتھ منعقدہ نکاح کو عدالت صحیح مان کر عورت و بچوں کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے، جبکہ کم عمری یا جبری نکاح جیسے معاملات میں قانون کی خلاف ورزی پر الگ سزائیں بھی موجود ہیں۔ یوں فقہی تقسیم اور ملکی قانون کے باہمی مطالعے سے طالب علم کو یہ سمجھ آتی ہے کہ مقصد عنوان کی پابندی نہیں بلکہ حقوق کی حفاظت اور انجام دہی بجاؤ ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ نکاحِ صحیح وہ ہے جس کے ارکان و شرائط مکمل ہوں اور اس کے تمام آثار مرتب ہوں؛ نکاحِ فاسد وہ ہے جس کی اصل درست مگر وصف میں خلل ہو، اس میں جدائی واجب ہے اور خلوت کے بعد مہر، عدت اور نسب جیسے محدود آثار پیدا ہوتے ہیں؛ اور نکاحِ باطل وہ ہے جس کا انعقاد ہی حرام بنیاد پر ہو، وہ کالعدم ہے اور اس کا کوئی شرعی اثر نہیں بنتا۔ یہ تقابلی سمجھ آئندہ کے ابواب، خصوصاً عدت، مہر اور میراث کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سوال نمبر 4: کفاءت اور مہر کے اصول و احکام اور ان کی اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 4: کفاءت اور مہر کے اصول و احکام کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی معاشرتی اور قانونی اہمیت پر بحث کریں۔

تعارف

نکاح کی کامیابی کا انحصار صرف عقد کے درست انعقاد پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر بھی ہے جو ازدواجی زندگی کو ہم آہنگی اور عدل عطا کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں کفاءت اور مہر سرفہرست ہیں۔ کفاءت کا تعلق رشتے کے انتخاب میں برابری اور مناسبت سے ہے، جبکہ مہر عورت کا وہ مالی حق ہے جو نکاح کے نتیجے میں شوہر پر واجب ہوتا ہے۔ دونوں کی غرض ازدواجی زندگی کو تکریم، توازن اور تحفظ فراہم کرنا ہے: کفاءت ذہنی و معاشرتی ہم آہنگی کی پیشگی ضمانت ہے اور مہر عورت کی معاشی و سماجی قدر کا علامتی و عملی اظہار۔

ذیل میں پہلے کفاءت کی تعریف، معیارات اور اس سے متعلق فقہی آراء بیان کی جائیں گی پھر مہر کی تعریف، اقسام، مقدار اور ادائیگی کے احکام واضح کیے جائیں گے، اور آخر میں دونوں کی معاشرتی و قانونی اہمیت پر بحث کی جائے گی۔

کفاءت: تعریف اور معیارات

کفاءت کے لغوی معنی برابری اور مثل ہونے کے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں کفاءت سے مراد یہ ہے کہ مرد دین، نسب، پیشے، مال اور دیگر معاشرتی اوصاف میں عورت کے برابر یا اس کے مناسب ہو تاکہ ازدواجی زندگی میں ذلت یا عدم ہم آہنگی کا احساس پیدا نہ ہو۔ یہ شرط اصل میں عورت اور اس کے ولی کا حق ہے، کیونکہ اگر عورت اپنے سے بہت کم درجے کے مرد سے بیاہ دی جائے تو اسے اور اس کے خاندان کو معاشرتی طور پر باعثِ عار صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور فقہا نے اسی بنا پر ولی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ غیر کفو میں کیے گئے نکاح پر اعتراض کر سکے۔

حنفی فقہا نے کفاءت کے معیارات میں دین و دیانت کو سب سے مقدم رکھا ہے، کیونکہ فاسق مرد دیندار عورت کا کفو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد نسب، پیشہ، مال و دولت اور آزادی کو شامل کیا گیا ہے۔ البتہ یہ امر اہم ہے کہ کفاءت کا معیار عرف پر مبنی ہے اور ہر زمانے و علاقے کے عرف کے مطابق بدل سکتا ہے۔ آج کے دور میں تعلیم، اخلاق اور پیشہ ورانہ استحکام کو معاشرے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس لیے کفاءت کا جائزہ موجودہ عرف کی روشنی میں لینا چاہیے۔ یہ بھی یاد رہے کہ کفاءت صرف مرد میں دیکھی جاتی ہے؛ عورت کا مرد سے کم درجے کا ہونا نکاح کے لیے مانع نہیں سمجھا جاتا۔

کفاءت میں فقہی اختلاف اور اس کا دائرہ

کفاءت کے معیارات میں فقہا کا اختلاف اس باب کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ امام مالک کے نزدیک کفاءت کا اصل معیار صرف دین ہے؛ نسب و پیشے کی برابری شرط نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام نے انسانوں کی قدر تقویٰ سے وابستہ کی ہے اور رنگ و نسل کی تفریق ختم کی ہے۔ امام شافعی نے نسب، دین، پیشے اور عیوب سے سلامتی کو معتبر مانا، جبکہ احناف نے مذکورہ تفصیل کے ساتھ کفاءت کو ولی و عورت کا حق قرار دیا۔ جمہور کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ کفاءت نکاح کی صحت کی شرط نہیں بلکہ لزوم کی شرط ہے، یعنی غیر کفو میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے مگر ولی کو عدت و بلوغ کا لحاظ رکھ کر اعتراض کا موقع حاصل رہتا ہے، بشرطیکہ عورت حاملہ نہ ہو گئی ہو یا بچہ پیدا نہ ہو چکا ہو، کیونکہ اس کے بعد اعتراض کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔

کفاءت کے باب میں توازن بہت ضروری ہے۔ ایک طرف اسے اتنا سخت نہیں بنانا چاہیے کہ ذات پات اور خاندانی انا کی بنیاد پر اچھے رشتے ٹھکرائے جانے لگیں اور نکاح مشکل ہو جائے، کیونکہ حدیث میں ہدایت ہے کہ جب تمھارے پاس وہ شخص آئے جس کے دین و اخلاق سے تم راضی ہو تو اس سے نکاح کر دو۔ دوسری طرف کفاءت کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی دانشمندی نہیں، کیونکہ طرزِ زندگی اور ذہنی سطح میں شدید فرق ازدواجی زندگی میں تناؤ پیدا کرتا ہے۔ فقہی نظام نے ولی کو اعتراض کا حق دے کر اور ساتھ ہی عورت کی رضامندی کو اہمیت دے کر یہی درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔

مہر: تعریف، شرعی بنیاد اور اقسام

مہر وہ مال ہے جو نکاح کے سبب شوہر پر بیوی کے لیے واجب ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے سورۃ النساء میں حکم دیا کہ عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے ادا کرو، اور مہر کو صدقہ یعنی طوعاً دیا جانے والا حق کہا گیا ہے۔ مہر بیوی کی قیمت نہیں بلکہ اس کی تکریم، نکاح کی سنجیدگی اور شوہر کی ذمہ داری کا اظہار ہے؛ یہ خالصتاً عورت کا حق ہے، اس میں سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر شوہر، والدین یا کوئی اور نہیں لے سکتا۔ اگر عورت خود خوشی سے کچھ چھوڑ دے تو وہی مقدار ساقط ہو سکتی ہے۔

مہر کی اقسام دو اعتبار سے ہیں۔ تعین کے اعتبار سے مہر مسمّی وہ ہے جو عقد کے وقت فریقین نے خود متعین کیا ہو، اور مہر مثل وہ ہے جو اس عورت کی خاندانی ہم مرتبہ عورتوں، مثلاً اس کی بہن، پھوپھی یا چچازاد کو عموماً ملتا ہو؛ جب مہر مقرر نہ کیا گیا ہو یا مقرر کردہ مہر باطل ہو تو مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔ ادائیگی کے اعتبار سے مہر معجل وہ ہے جو فوراً طلب کیا جا سکے، اور اس کے ملنے تک عورت کو اپنے آپ کو روکنے کا حق بھی فقہا نے دیا ہے، جبکہ مہر غیر معجل یا مؤجل وہ ہے جس کی ادائیگی کسی مدت یا مطالبے پر مؤخر کر دی گئی ہو۔ پاکستان میں نکاح نامے میں مہر کے معجل و غیر معجل کی کالم باقاعدہ درج ہوتی ہے، اس لیے اسے سوچ سمجھ کر پُر کرنا چاہیے۔

مہر کی مقدار اور وجوب کے احکام

مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار کی کوئی حد مقرر نہیں؛ فریقین کی باہمی رضامندی سے کتنی ہی رقم مقرر کی جا سکتی ہے، البتہ سنت کی روشنی میں مہر میں آسانی اور اعتدال پسندیدہ ہے، کیونکہ بھاری مہر نکاح کو مشکل اور قرض داری کا سبب بناتا ہے۔ کم سے کم مقدار میں فقہا کا اختلاف ہے: احناف کے نزدیک کم از کم دس درہم ہونا چاہیے، اس سے کم مقرر کیا جائے تو بھی دس درہم ہی واجب ہوں گے۔ امام مالک کے نزدیک اس کی ایک کم ترین حد مقرر ہے، جبکہ امام شافعی کے نزدیک کوئی حد نہیں، جو کچھ بھی مال کہلائے مہر بن سکتا ہے۔ یہ اختلاف سہولت کی گنجائش ظاہر کرتا ہے، اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ مہر طے ضرور ہو اور ادا بھی کیا جائے۔

مہر کے مکمل وجوب کے مواقع تین ہیں: خلوتِ صحیحہ ہو جائے، شوہر یا بیوی میں سے کسی کی وفات ہو جائے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے، اور جب طلاق خلوت سے پہلے واقع ہو تو مقررہ مہر کا نصف واجب ہوتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں صراحت ہے۔ اگر مہر مقرر ہی نہ تھا اور طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی تو عورت کو متعہ یعنی حسبِ استطاعت کچھ دے کر رخصت کیا جائے گا۔ یہ احکام عورت کے مالی تحفظ کا مکمل نظام ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ظلم ہے، اور قرآن نے بیوی سے دیا ہوا مال واپس لینے سے سختی سے منع بھی کیا ہے۔

معاشرتی و قانونی اہمیت

کفاءت اور مہر کی معاشرتی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ کفاءت ہم آہنگ رشتوں کی حوصلہ افزائی کر کے طلاق و تنازعات کی شرح کم کرتی ہے، اور مہر عورت کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اسے معاشرے میں ایک باعزت حق حاصل ہے۔ مہر بیوی کے لیے ہنگامی حالات میں مالی سہارا بھی بن سکتا ہے اور یہ شوہر کو غیر سنجیدہ نکاح اور فوری طلاق سے روکنے کا

ذریعہ بھی ہے، کیونکہ طلاق کی صورت میں مہر کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اسی بنا پر مہر کو محض رسمی رقم سمجھ کر علامتی طور پر لکھ دینا اور پھر «معاف کرانے» کی روایت اس کے مقصد کو ختم کر دیتی ہے؛ معافی عورت کا اختیار ہے، دباؤ سے حاصل کی گئی معافی اخلاقاً و شرعاً درست رویہ نہیں۔

قانونی اعتبار سے پاکستانی عدالتیں مہر کو عورت کا قابلِ وصول حق مانتی ہیں اور اس کی عدم ادائیگی پر ڈگری جاری ہوتی ہے۔ نکاح نامے میں درج مہر دستاویزی ثبوت ہوتا ہے، اسی لیے نکاح خواں اور فریقین پر لازم ہے کہ مہر کی مقدار اور معجل و مؤجل کی تفصیل واضح اور سچی درج کریں۔ کفاءت کے سلسلے میں اگرچہ ملکی قانون میں ولی کے اعتراض کا طریقہ محدود ہو چکا ہے، لیکن بالغ عورت کی رضامندی کو عدالت بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ یوں فقہی اصول اور ملکی قانون دونوں کا مجموعی پیغام یہی ہے کہ رشتہ مناسب بھی ہو اور عورت کا حق محفوظ بھی رہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ کفاءت دین، نسب، پیشے اور دیگر عرفی اوصاف میں مرد کی عورت کے مناسب ہونے کا نام ہے، یہ عورت و ولی کا حق ہے اور نکاح کے لزوم سے متعلق ہے؛ جبکہ مہر عورت کا وہ واجب مالی حق ہے جو نکاح کے سبب شوہر پر عائد ہوتا ہے، اس کی اقسام مسمّٰی و مثل اور معجل و مؤجل ہیں، اور اس کے وجوب و نصف ہونے کے واضح قرآنی احکام موجود ہیں۔ دونوں ادارے مل کر ازدواجی زندگی کو ہم آہنگی، تکریم اور مالی تحفظ عطا کرتے ہیں، اسی لیے ان کی درست تفہیم اور عملی پاسداری ہر خاندان کے لیے ضروری ہے۔

سوال نمبر 5: تعددِ ازواج کے شرعی اصول اور زوجین کے باہمی حقوق و فرائض (20 نمبر)

سوال نمبر 5: تعددِ ازواج کے شرعی اصول اور زوجین کے باہمی حقوق و فرائض کا قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لیں۔

تعارف

اسلام نے خاندانی زندگی کو عدل و توازن پر قائم کیا ہے۔ تعددِ ازدواج یعنی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا مسئلہ انہی مباحث میں سے ہے جن پر اکثر بحث غیر متوازن انداز میں ہوتی ہے، حالانکہ قرآن مجید نے اسے نہ تو فرض کیا ہے اور نہ ہی مطلق اجازت دی ہے، بلکہ اسے سخت شرائط کے ساتھ محدود اور مقید رکھا ہے۔ اسی طرح زوجین کے باہمی حقوق و فرائض بھی اسلامی خاندانی نظام کی روح ہیں: سورۃ الروم میں سکون، محبت اور رحمت کو نکاح کے مقاصد قرار دیا گیا ہے، اور سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر معروف طریقے سے فرائض ہیں۔

اس سوال میں پہلے تعددِ ازدواج کے قرآنی اصول و شرائط کا جائزہ لیا جائے گا، پھر اس کی حکمت و فائدے پر روشنی ڈالی جائے گی، اور آخر میں زوجین کے مشترکہ اور انفرادی حقوق و فرائض قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیے جائیں گے۔

تعددِ ازدواج کا قرآنی اصول

تعددِ ازدواج کی بنیادی دلیل سورۃ النساء کی آیت نمبر 3 ہے جس میں فرمایا گیا کہ اگر تمھیں یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین اور چار چار تک نکاح کر لو، اور اگر تمھیں عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو صرف ایک ہی پر اکتفا کرو۔ اس آیت کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ اجازت ایک مخصوص معاشرتی پس منظر میں دی گئی اور اسے عدل کی شرط سے مشروط کر دیا گیا۔ اسی سورت کی آیت نمبر 129 میں یہ تنبیہ بھی آئی ہے کہ چاہنے کے باوجود بیویوں کے درمیان مکمل قلبی برابری ممکن نہیں، اس لیے کسی ایک طرف مکمل جھکاؤ سے دوسری کو معلق نہ چھوڑو۔ ان دونوں آیات کو ملا کر فقہا نے یہ اصول اخذ کیا کہ تعداد کی حد زیادہ سے زیادہ چار ہے، اور ظاہری معاملات میں عدل فرض ہے۔

تاریخی طور پر اسلام سے پہلے عرب و دیگر معاشروں میں بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی اور عورت کو عملاً کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اسلام نے اس غیر محدود رواج کو چار تک محدود کیا، موجودہ زائد بیویوں سے علیحدگی کا حکم دے کر عملاً اس پابندی کو نافذ کیا، اور عدل و کفالت کو شرط قرار دے کر اس اجازت کو انصاف کے تابع کر دیا۔ اس لیے تعددِ ازواج کو اسلام کی ایجاد کہنا درست نہیں؛ یہ ایک موجودہ عالمی رواج کی اصلاح و تحدید ہے، جس کا رخ عورت کے تحفظ کی طرف رکھا گیا۔

تعددِ ازواج کی شرائط اور حدود

فقہا نے قرآن و سنت کی روشنی میں تعددِ ازواج کے لیے چند شرائط طے کی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد چار سے زیادہ نہ ہو؛ پانچویں کا نکاح اس وقت تک درست نہیں جب تک پہلی چار میں سے کوئی ایک رشتہ ختم نہ ہو جائے۔ دوسری شرط عدل ہے: شوہر نفقہ، رہائش، باری اور حسنِ سلوک میں بیویوں کے درمیان برابری کرے؛ یہ ظاہری عدل انسان کے اختیار میں ہے اور اسی کا وہ مکلف ہے، جبکہ دلی میلان اختیار سے باہر ہونے کی بنا پر معاف ہے۔ تیسری شرط مالی استطاعت ہے: جو شخص ایک سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کی صلاحیت نہ رکھے اس کے لیے دوسری شادی غیر ذمہ دارانہ فعل ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ اس عمل سے کسی فریق کو ضرر نہ پہنچے اور خاندان میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔

پاکستان کے قانون میں مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961 کے تحت دوسری شادی کے لیے یونین کونسل کی ثالثی کونسل سے اجازت اور موجودہ بیوی یا بیویوں کو اطلاع دینا قانونی تقاضا ہے، جس کی خلاف ورزی پر سزا اور پہلی بیوی کو فوری مہر کی ادائیگی و تفریق کا حق جیسے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ قانونی تقاضے شرعی روح کے خلاف نہیں بلکہ اسی عدل و شفافیت کو یقینی بنانے کی کوشش ہیں، کیونکہ خفیہ دوسری شادی عموماً پہلی بیوی کے حقوق کی پامالی اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ کا سبب بنتی ہے۔

تعددِ ازواج کی حکمت اور متوازن جائزہ

اس اجازت کی حکمتیں معاشرتی حقائق سے جڑی ہیں۔ جنگوں یا وباؤں کے بعد معاشرے میں بیواؤں اور یتیم بچوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، ایسی صورت میں ذمہ دار تعددِ ازواج ان عورتوں کو باعزت گھر اور بچوں کو سرپرستی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح پہلی بیوی کی دائمی بیماری، بانجھ پن یا اولاد کی خواہش جیسے حالات میں طلاق دے کر عورت کو بے

یا رومد دگار چھوڑنے کے بجائے اس کا رشتہ بر قرار رکھتے ہوئے دوسری شادی نسبتاً بہتر حل ہو سکتی ہے۔ بعض جغرافیائی و سماجی ماحول میں بھی اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ تمام صورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ تعدد کو ضرورت و اہلیت کی بنیاد پر پرکھا جائے، محض خواہش کی بنیاد پر نہیں۔

متوازن جائزہ یہی ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم وحدتِ خاندان اور عدل ہے؛ ایک بیوی کو معمول اور عدل نہ کر سکنے والے کے لیے واحد راستہ بتایا گیا ہے، اور تعدد کو ایک مشروط اجازت کے طور پر رکھا گیا ہے جن کی شرائط پوری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ موجودہ دور میں اس موضوع پر لکھتے ہوئے نہ تو اس شرعی اجازت کا انکار درست ہے اور نہ ہی اس کی شرائط کو نظر انداز کر کے اسے فروغ دینا۔ اصل پیغام انصاف، شفافیت اور [illegible] کی ہے، جس کے بغیر یہ اجازت اپنی روح کھو دیتی ہے۔

زوجین کے مشترکہ حقوق و فرائض

قرآن مجید نے ازدواجی زندگی کی بنیاد سکون، محبت اور رحمت کو قرار دیا ہے، اس لیے سب سے بڑا مشترکہ فریضہ حسن معاشرت ہے: میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی سے پیش آئیں، جیسا کہ حکم ہے کہ عورتوں کے ساتھ معروف طریقے سے زندگی بسر کرو۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور امین ہیں؛ خاندانی راز افشا کرنا خیانت ہے۔ دونوں پر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، اولاد کی مشترکہ تربیت کرنا، گھریلو فیصلوں میں مشورہ کرنا اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین شخص اسے قرار دیا جو اپنے اہل کے لیے بہترین ہو، اور آپ کا اپنا عمل اس کی عملی تصویر ہے۔

مشترکہ حقوق میں ایک اہم حق باہمی میراث ہے: نکاحِ صحیح کی بنا پر شوہر و بیوی ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کا نسب دونوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اور دونوں کی مشترکہ ذمہ داری بنتا ہے۔ معاشرتی سطح پر دونوں کو ایک دوسرے کی عزت کی حفاظت کرنی ہے، نہ زبان سے ایذا دینی ہے اور نہ ہاتھ سے؛ اختلاف کی صورت میں باہمی گفتگو، پھر خاندان کے حکم یعنی ثالثوں کے ذریعے حل کی قرآنی تدبیر موجود ہے۔ یہ ضابطے بتاتے ہیں کہ اسلامی خاندان طاقت پر نہیں انصاف و مشورے پر قائم ہے۔

بیوی کے حقوق اور شوہر کے فرائض

بیوی کے مالی حقوق میں مہر اور نفقہ بنیادی ہیں۔ مہر اس کا خالص حق ہے، اور نفقے میں خوراک، لباس اور رہائش شوہر کی استطاعت کے مطابق اس پر واجب ہے، خواہ بیوی خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ عدت کے دنوں کا نفقہ اور رہائش بھی مخصوص شرائط کے ساتھ شوہر کے ذمے ہے۔ غیر مالی حقوق میں حسنِ سلوک، عدل (اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں)، اس کی عزت و آبرو کی حفاظت، اس کے دینی فرائض کی ادائیگی میں سہولت، اور اس کے میکے سے مناسب میل جول کی اجازت شامل ہے۔ بیوی کی مرضی کے خلاف اس کے مال میں تصرف کرنا شوہر کے لیے جائز نہیں، کیونکہ عورت اپنے مال کی مکمل مالک ہے۔

شوہر کے فرائض کا دوسرا پہلو ذہنی و جذباتی ذمہ داری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے متعلق بھلائی کی وصیت بار بار فرمائی اور انہیں امانت قرار دیا۔ اسی لیے بیوی کی بیماری میں تیمارداری، اس کی رائے کا احترام اور گھر کے معاملات میں اسے شریک رکھنا شوہر کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ جو شوہر نفقہ روکتا ہے یا بلاوجہ ایذا دیتا ہے، وہ شرعاً گناہگار اور قانوناً قابلِ مؤاخذہ ہے، اور عورت کو عدالت سے نفقہ و تحفظ حاصل کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

شوہر کے حقوق اور بیوی کے فرائض

شوہر کے حقوق میں سب سے اہم معروف میں اطاعت ہے، یعنی جائز اور نیک کاموں میں بیوی شوہر کی قیادت کو تسلیم کرے، کیونکہ ہر اجتماعی نظام کو ایک سربراہ درکار ہوتا ہے اور قرآن نے گھر کی قوامیت مرد کو اس کے مالی فرائض کی بنا پر دی ہے۔ اس اطاعت کا دائرہ معروف ہے؛ اللہ کی نافرمانی والے کام میں کسی کی اطاعت نہیں۔ اس کے علاوہ شوہر کے مال و عزت کی حفاظت، اس کی اجازت کے دائرے میں گھر کی نگرانی، اور ایسے شخص کو گھر میں داخل نہ کرنا جسے شوہر ناپسند کرے، بیوی کے فرائض میں شمار ہوتے ہیں، جن کا مقصد گھر کا امن و اعتماد برقرار رکھنا ہے۔

بیوی کا فرض یہ بھی ہے کہ شوہر کی استطاعت کا لحاظ رکھے، غیر ضروری مطالبات سے اسے پریشان نہ کرے، اور بچوں کی تربیت میں اس کی معین و مددگار بنے۔ فقہا نے واضح کیا ہے کہ شوہر کے حقوق کا تقاضا بیوی کی شخصیت کی نفی نہیں؛ نکاح کے ذریعے عورت اپنی قانونی اہلیت، مال کی ملکیت اور رائے کے حق سے محروم نہیں ہوتی۔ قرآن و سنت کا

متوازن نظام یہی ہے کہ شوہر کی سربراہی خدمت و کفالت کی ذمہ داری سے بندھی ہو اور بیوی کی اطاعت معروف اور عدل کے دائرے میں ہو، تاکہ گھر اجارہ داری نہیں بلکہ محبت و رحمت کا ماحول بنے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تعددِ ازواج اسلام میں چار کی حد، عدل، استطاعت اور ضرر کی شرائط کے ساتھ مشروط اجازت ہے، جس کی اصل حکمت معاشرتی ضرورتوں اور کمزور طبقات کے تحفظ سے جڑی ہے، اور پاکستان میں اس کے لیے قانونی اجازت و شفافیت کا نظام بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ زوجین کے حقوق و فرائض قرآن و سنت میں باہمی توازن کے ساتھ بیان ہوئے ہیں: بیوی کو مہر، نفقہ، عزت اور حسنِ سلوک کا، اور شوہر کو معروف میں اطاعت، امانت اور تعاون کا حق حاصل ہے، جبکہ سکون و محبت دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہی توازن اسلامی خاندان کو کامیاب بناتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com